(اداریہ)

رسول کریم ﷺ کا یوم ولادت اور ہمارا طرز عمل

انسانی سوسائٹی کے مختلف گروہوں میں ہمیشہ سے بوجوہ اضطراب، قلق اور بے چینی پائی جاتی رہی ہے، جس کا ظہور ہم اکثر تشدد اور توڑ پھوڑ کے خونی ہنگاموں میں دیکھتے رہتے ہیں۔ اس داخلی بے چینی کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ انسان عموماً اس جانی پہچانی حقیقت کا اعتراف کرنے سے برابر انکار کرتا رہا ہے کہ سوسائٹی کے تمام لوگ خواہ ان کا کسی بھی عقیدہ، نسل اور زبان سے تعلق ہو، اللہ کی مخلوق ہیں، جو دکھ درد، سکھ چین، رنج والم اور مسرت وانبساط کے ایک ہے جذبات و عواطف رکھتے ہیں اور ایک باوقار زندگی بسر کرنے کا احساس دروں۔ چنانچہ جب کبھی سوسائٹی کا کوئی فرد یا گروہ انسان کے اس فطری حق (باوقار زندہ رہنے کا حق) پر حملہ کرتا ہے، تو وہ اپنے بچاؤ کے لیے ہر ممکن تدبیر اختیار کرتا ہے۔ اگر وہ ظالم کا سامنا کرنے کی سکت نہیں رکھتا تو وہ اپنے حقوق کی بازیابی کے لیے مناسب وقت آنے پر ظالم کو نیچا دکھانے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔

الغرض انسانی زندگی کی کہانی بہ قول ابن خلدون ایک ہے جو تاریخ کے سٹیج پر مختلف ناموں سے دہرائی جا رہی ہے۔ ہم اس کہانی کو نہ صرف تاریخ کی کتابوں میں پڑھتے ہیں، بلکہ بعض اوقات اس کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے بھی کرتے ہیں۔ ہم نے بیسویں صدی میں دیکھا کہ کتنی ہی غلام قوموں نے اپنی کھوئی ہوئی آزادی کو واپس لے لیا اور دنیا کی بڑی طاقتوں کو میدان جنگ میں سربکف قوموں کے سامنے اپنا سر جھکانا پڑا۔ الجزائر کی جنگ آزادی ہمارے سامنے لڑی گئی۔ خود ہم نے اس پاک و ہند میں برطانوی جھنڈے کو دو سو سال کے بعد سرنگوں ہوتے ہوئے دیکھا۔ بیسویں صدی کا سب سے بڑا انقلاب ۱۹۱۷ء کا اشتراکی انقلاب تھا۔ جس نے

مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کو پہلی بار فکری اور عملی سطح پر موثر طور پر چیلنج کیا۔ مغرب کے فلسفہ اخلاق' قانون' سیاست' معیشت کے بخیے ادھیڑ دیے۔ سرمایہ داری کی سیاست ایک پاپ شمار ہونے لگی۔ اقبال نے' جو دور سرمایہ داری کو "مداری کا تماشہ" قرار دیتے ہیں' مغربی دنیا کے ایوانہائے اقتدار میں ہل چل کو دیکھ کر کہا:

مے خانہ کی بنیاد میں آیا ہے تزلزل
بیٹھے ہیں اس فکر میں پیران خرابات

انسانی زندگی کو بامعنی بنانے اور اس کے وقار کو بحال کرنے کے لیے ایک منفرد فکری اور روحانی انقلاب دنیا نے ساتویں صدی میں حجاز میں دیکھا۔ جس نے تاریخ کے دھارے کو بدل دیا اور انسانی فکر پر ایک نئی صبح مسکرائی۔ اس انقلاب کی بنیاد زمین و آسمان کے ٹوٹے ہوئے رشتوں کو جوڑنے اور انسان کے تزکیہ قلب و نظر پر رکھی گئی۔ اس اخلاقی انقلاب نے بتایا کہ سوسائٹی کی اصلاح اور انسانی وقار کے تحفظ کے لیے انسان کو سب سے پہلے خود اپنے آپ سے جنگ کرنا ہوگی۔ اسے بتایا گیا کہ وہ اپنے اندر کے شیطان پر قابو پا کر ہی سوسائٹی کے شیطان پر قابو پا سکتا ہے۔ رسول کریم ﷺ جب آٹھ سال کے بعد دوبارہ مکہ میں داخل ہوئے تو آپ نے اہل مکہ کی مغرور قیادت سے فرمایا: "اے قوم قریش! آج خدا نے جاہلیت کے غرور اور سارے بتان فخر و افتخار کو مٹا دیا ہے۔ (یاد رکھو کہ) تمام انسان آدم کی نسل سے ہیں اور آدم مٹی سے بنے ہیں۔"

دو سال بعد آپ نے اپنی وفات سے قبل سن ۱۰ ہجری میں آخری حج فرمایا اور حج کے مختلف مقامات پر اسلام کے بنیادی پیغام کو بار بار بیان فرمایا' تاکہ سننے والے اس کی صحیح اہمیت اور عظمت کا اندازہ لگا سکیں۔ آپ نے فرمایا: لوگو یاد رکھو! تمہاری جان' تمہارا مال اور تمہاری آبرو اسی طرح مقدس ہے' جس طرح یہ دن اس مہینہ میں اور یہ سرزمین مقدس

ہے۔"[1]

آپ نے مقام عرفات میں فرمایا: "ہاں! جاہلیت کے تمام دستور (رسم و رواج) آج میرے دونوں پاؤں کے نیچے ہیں' یعنی ساقط کیے جا چکے ہیں۔" حسب نسب کی بنیاد پر فخر کرنے والوں کے بارے میں فرمایا: "لوگو! بے شک تمہارا پروردگار ایک ہے۔ اور بے شبہ تمہارا باپ ایک ہے۔ کسی عربی کو غیر عربی پر اور کسی غیر عربی کو عربی پر' گورے کو کالے پر اور کالے کو گورے (سرخ) پر کوئی برتری حاصل نہیں' اگر کوئی فضلیت ہے تو صرف تقویٰ اور پرہیز گاری کو۔"

آپ نے دور جاہلیت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: "اس دور کے تمام خون' (انتقام) ساقط کر دیئے گئے ہیں۔ سب سے پہلے میں (اپنے خاندان کا خون یعنی) ربیعہ بن حارث کے بیٹے کا خون ساقط کرتا ہوں۔"

چوں کہ مکہ کی اجتماعی زندگی میں کمزور گروہ کی آواز سنی نہیں جاتی تھی اور بڑی بے رحمی سے اس کا معاشی استحصال ہوتا تھا۔ آپ نے فرمایا: "دور جاہلیت کا سودی کاروبار آج ساقط ہو چکا ہے۔ سب سے پہلے میں (اپنے چچا) عباس بن عبدالمطلب کا سود ساقط کرتا ہوں۔" اسی تقریر میں آپ نے یہ بھی فرمایا: "میں تمہارے لیے اللہ کی کتاب چھوڑے جا رہا ہوں۔ اگر تم نے اسے مضبوطی سے تھامے رکھا' تو تم گمراہی سے یقیناً بچ جاؤ گے۔"[2]

عرب سوسائٹی میں غریب کی جان' مال' آبرو کو کوئی تحفظ حاصل نہیں تھا۔ اور یہی وہ چیزیں ہیں' جن کی وجہ سے آج ساری دنیا میں ہنگامہ بپا ہے۔ اگر کوئی حکومت اپنے شہریوں کو جان' مال اور آبرو کا تحفظ فراہم نہیں کرتی تو ایسی حکومت کو جائز یا کامیاب حکومت تصور نہیں کیا جاتا۔ دیکھئے کہ آج سے چودہ سو سال قبل آنحضرت ﷺ نے اس موضوع پر بار بار یہ

(۱) صحیح بخاری' کتاب الحج میں ابن عمر کی روایت میں "اعراضکم" (تمہاری آبرو) بھی آیا ہے۔ نیز دیکھئے ابن سعد کی طبقات حجۃ الوداع۔

(۲) سنن ابی داؤد' کتاب المناسک۔ (بعض روایات میں کتاب اللہ کے ساتھ ساتھ آپ نے "اہل بیت" کا ذکر بھی فرمایا ہے۔ البتہ ابن ہشام نے سیرہ رسول اللہ میں کتاب اللہ کے ساتھ سنت النبی کا بھی ذکر کیا ہے۔)

فرمایا: ''تمہارا خون' تمہارا مال تمہاری آبرو تا قیامت اسی طرح حرام ہے جس طرح یہ دن' اس مہینہ میں اور اس شہر میں حرام ہے۔''

آج دنیا نے اس بات کو مان لیا ہے کہ ملک کے ہر شہری کی جان و مال اور عزت کا تحفظ حکومت کے بنیادی فرائض میں داخل ہے جو حکومت ان فرائض سے عہدہ برا نہیں ہو سکتی۔ اسے حکومت میں رہنے کا کوئی حق بھی نہیں۔

رسول کریم نے اپنے آخری حج میں ہمیں جن باتوں پر بار بار متنبہ فرمایا ہے۔ انہی فرمودات کی ایک جھلک ہم حضرت ابوبکر کی پہلی تقریر میں دیکھتے ہیں۔ جو آپ نے خلیفہ بننے کے بعد فرمائی۔ آپ نے فرمایا ''حکومت ان لوگوں کے حقوق کا تحفظ کریگی جو خود اپنا تحفظ نہیں کر سکتے' اور جو لوگ (بزعم خویش) طاقت ور ہیں وہی لوگ میری نگاہ میں کمزور ہیں۔ تا آں کہ ان سے غصب شدہ حقوق کو واپس نہ لے لوں۔''

یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ سوسائٹی میں قانون کی حکمرانی کو قائم کرنے اور اس کی داخلی بے چینی کو دور کرنے کے لیے رسول کریم ﷺ نے جن بنیادی باتوں کا بار بار ذکر فرمایا تھا اور جن کو حضرت ابوبکر صدیق نے اپنی حکومت کی بنیادی پالیسی قرار دیا تھا۔ انہی باتوں کا ذکر صدیوں کے بعد پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی میں ۱۱ر اگست ۱۹۴۷ء میں سنا گیا۔ جب بانی پاکستان محمد علی جناح نے اپنی پہلی تاریخ تقریر میں جو اپنے حسن افکار اور حسن الفاظ کی بناء پر بہترین تقریر ہے' صاف طور پر کہا: ''آپ بے شبہ مجھ سے اس بات پر اتفاق کریں گے کہ حکومت کی سب سے پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ نظم وضبط اور قانون قائم کرے' تاکہ ریاست اپنے شہریوں کی جان' مال اور مذہبی عقائد کا پورے طور پر تحفظ کر سکے۔'' آپ نے تقریر میں واضح طور پر رشوت اور کرپشن کو سب سے بڑی لعنت قرار دیا اور کہا: ''ہمارا فرض ہے کہ ہم آہنی ہاتھ سے اس لعنت کا خاتمہ کریں۔''

یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ آج ہم اپنے آپ کو کیوں بھول گئے ہیں؟ اور اپنی بلند

روایات کو ہم نے کہاں کھو دیا؟ میکالے نے برطانوی دستور کے بارے میں لکھا تھا کہ یہ برطانوی قوم کی سیاسی عبقریت (Political Genius) کا منفرد مظاہرہ ہے۔ کسی زمانہ میں مسلم جماعت کی فکری عبقریت کا بہترین مظاہرہ انصاف اور رواداری کی شکل میں سامنے آیا تھا۔ حتیٰ کہ دور انحطاط میں بھی ہم نے اس روایت کو کسی حد تک زندہ رکھا۔ اکبر کے نورتن ابوالفضل نے ایران کے شاہ عباس کو اپنے خط میں عدل و انصاف کو انتظامیہ کی بنیاد ی اینٹ قرار دیتے ہوئے لکھا تھا: ''مشہور صوفی رہنما علاء الدولہ سمنانی نے جو اپنے ابتدائی دور میں وزیر بھی رہ چکے تھے' خواب میں دیکھا کہ قیامت کا دن ہے اور خدا نے حکم دیا ہے کہ علاء الدولہ سمنانی کی ساری طاعت و بندگی ترازو کے ایک پلڑے میں اور سمنانی کا وہ فیصلہ جو اس نے اپنے دور وزارت میں ایک بڑھیا کا حق دلوانے کے لیے کیا تھا' دوسرے پلڑے میں رکھ دیا جائے۔ گویا ایک بے بس بڑھیا کو انصاف دلانے کا ایک واقعہ سمنانی کی ساری طاعت و بندگی کے برابر ہے۔ افسوس یہ تاریخی ورثہ بھی ہاتھ سے جاتا رہا۔

رسول کریم ﷺ کے یوم ولادت پر ہمارا فرض ہے کہ ہم سنجیدگی سے اپنے اور اپنے گردو پیش کا جائزہ لے لیں اور دیکھیں کہ کیا ہم نے دکھی لوگوں کو رشوت' کرپشن اور مہنگائی کی قید سے رہائی دلانے کے لیے کوئی ڈھنگ کا کام کیا ہے؟ کیا پاکستانی سوسائٹی میں غریبوں کی جان' مال اور آبرو کو تحفظ حاصل ہے؟ ہمیں انتہائی دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ اگر آج اقبال اور جناح خلد بریں سے نکل کر ہماری دنیا میں آجائیں تو ہمیں دیکھ کر انہیں بڑا دکھ ہو گا۔

پروفیسر سید کرار حسین

ایک شاندار اور بھرپور علمی اور ادبی زندگی بسر کرنے کے بعد ۹ر نومبر ۱۹۹۹ء کو پروفیسر کرار حسین بھی دوسری دنیا میں پہنچ گئے' جہاں بزم ارواح بہت دنوں سے ان کی منتظر تھی۔

انہوں نے اپنی عمر کے ۸۲ برس "کاخ مجازی" میں بڑی اخلاقی ذمہ داری اور حزم و احتیاط سے بسر کیے اور بہ قول مولانا جامی "بچوں کی طرح کھیل کود" میں ضائع نہیں کیے۔

خاکسار نے ان کا نام سب سے پہلے ایک مرحوم دوست صدر الدین صدیقی سے سنا' جو ۱۹۷۱ء میں محکمہ اوقاف' پنجاب میں ڈپٹی سیکریٹری تھے۔ صدیقی صاحب سرکاری افسر کے ساتھ ساتھ صاحب ذوق اور زاہد و پارسا بھی تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ افلاطون نے یونان میں اپنی اکیڈمی میں داخلہ کے لیے جو کڑی شرائط رکھی تھیں۔ کرار حسین ان شرائط پر پورا اترتے تھے۔ مرحوم صدیقی کا تعلق بھی میرٹھ سے تھا' ان کے خاندان کا تعلق علمائے دیوبند سے تھا۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی میرٹھ میں ان کے دادا کے ہاں کبھی کبھی قیام بھی فرماتے تھے۔ وہ دارالعلوم دیوبند کو پابندی سے چندہ بھی دیتے تھے۔ صدیقی صاحب نے ڈاک خانہ کی رسیدیں بھی مجھے دکھلائی تھیں۔ صدیقی صاحب اپنے دونوں ساتھیوں کرار حسین اور حمید اختر خان کے ساتھ خاکسار پارٹی میں داخل ہوئے۔

صدیقی صاحب نے خاکسار تحریک کے بانی مرحوم عنایت اللہ مشرقی سے اپنی ملاقاتوں کا حال بھی بیان کیا تھا' جن میں کرار حسین اور حمید اختر شریک ہوتے تھے۔

خاکسار کی کرار حسین سے پہلی ملاقات ۱۹۷۶ء میں ہوئی۔ جب وہ ادارہ تحقیقات اسلامی' اسلام آباد کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کی میٹنگ میں تشریف لائے۔ ان دنوں خاکسار ادارہ سے منسلک تھا۔ جب کبھی اسلام آباد تشریف لاتے تو غربت کدہ کو بھی رونق بخشتے اور اپنی ادبی اور علمی گفتگو سے پوری محفل کو لوٹ لیتے۔

خدا نے انہیں جہاں علم و ادب سے نوازا تھا' وہاں اس نے انہیں حسن بیان کی دولت بھی عطا کی تھی۔ کرار حسین کا عارفانہ مزاج' تصنع' تکلف اور آورد سے یک قلم ناآشنا تھا۔ جس مسئلے پر بولتے' بڑی صفائی سے بولتے۔ ان کے فکر اور بیان میں کوئی الجھاؤ نہیں تھا۔ اس لیے ان کی بات دل سے نکلتی اور دل میں پیوست ہو جاتی۔ ان محفلوں میں انہوں نے

خاکسار تحریک سے اپنی وابستگی کا افسانہ بھی سنایا۔ عنایت اللہ مشرقی سے ان کی گفتگوئیں اور بات چیت بڑی دل چسپ تھی کہ خاکسار نے ان کے نوٹ بھی لیے تھے۔ جو کاغذات کے انبار میں کہیں دبے ہوئے ہیں۔ اگر بند غم سے کبھی نجات مل گئی تو پھر بھولی ہوئی یادداشتوں کو صفحۂ قرطاس کے سپرد کروں گا۔

ایک دفعہ پروفیسر موصوف (کرار حسین) نے اہل علم کی محفل میں مسلمانوں کے اجتماعی ارادہ پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم علم کلام کے بل پر انسانی شعور کے مسلسل ارتقاء پر پابندی نہیں لگا سکتے۔ بات اس موضوع پر ہو رہی تھی کہ مسلمان اپنی ساری کمزوریوں کے باوجود اسلام کی بلند قدروں سے محبت کرتے ہیں۔ مثلاً آزادی یا علم بلند قدریں ہیں۔ چنانچہ جب سرسید احمد مرحوم نے نئے علم کی طرف بلایا تو ان کے حریفوں نے ان پر بڑی پھبتیاں کسیں۔ طرح طرح کے الزامات لگائے۔ لیکن مسلمانوں کے اجتماعی شعور نے سرسید کے مخالفوں کو مسترد کرتے ہوئے نئے علم کو قبول کیا۔ کیوں کہ وہ "علم" کو ایک بلند قدر تصور کرتے ہیں۔ لیکن جب سرسید مرحوم نے انگریزی حکومت سے مصالحانہ رویہ اختیار کرنے کے لیے کہا تو مسلمانوں نے سرسید کی اس کے انداز فکر کو رد کر دیا۔ کیوں کہ وہ آزادی کو زندگی کی بنیادی قدر قرار دیتے ہیں' جیسا کہ اسلام نے کہا ہے۔

جب خاکسار ۱۹۸۰ء میں بلوچستان یونیورسٹی پہنچا تو دیکھا کہ یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد اور شہر کے اساتذہ پروفیسر سید کرار حسین کو بڑی محبت سے یاد کرتے ہیں کیوں کہ بلوچستان یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہ چکے تھے اور اپنے بلند طرز فکر اور طرز عمل سے لوگوں کو رام کر چکے تھے۔ پروفیسر موصوف کوئٹہ آتے یا خاکسار کراچی جاتا تو ان سے ملاقات رہتی۔ ۱۹۸۷ء میں کراچی میں پاکستان سٹڈی سینٹر کے فاضل ڈائریکٹر ڈاکٹر ایچ۔ ایم جعفری نے علامہ اقبال پر سیمینار کرایا۔ جس پر خاکسار نے بھی مقالہ پڑھا۔ کرار حسین سے ملنا ہوا' تو فرمایا کہ تم ایک دن میرے گھر پر آؤ۔ حمید اختر خان بھی تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ خاکسار ڈاکٹر جعفری

کے ہمراہ کرار حسین کے گھر گیا۔ حمید اختر خان کو پہلی بار دیکھا' جوانی ڈھل چکی تھی۔ لیکن ان کی بات چیت سے ان کے عزم و حوصلہ کا پتہ چلتا تھا۔ مجھ سے کہا کہ کیا وجہ ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ خون خرابے سے بھری پڑی ہے اور کوئی صفحہ دنگا فساد سے خالی نہیں ملتا۔ خاکسار نے عرض کیا کہ کون سی قوم ہے: ہندو' مسیحی یا اور کوئی قوم' جس کی تاریخ خون خرابہ سے پاک ہو۔ خود انگلستان اور ایرلینڈ کی تاریخ دیکھئے کہ اب تک جنوبی ایرلینڈ میں ایک ہی مذہبی اور لسانی قوم کے درمیان باہمی خونی جنگ ہو رہی ہے۔ فرق یہ ہے کہ ایک گروہ کا تعلق کیتھولک گروہ سے ہے۔ دوسرے گروہ کا تعلق دوسری مذہبی جماعت سے۔ لیکن اس خون خرابے میں مسلم جماعت میں صلاح الدین ایوبی' عمر بن عبدالعزیز اور دوسرے بڑے بڑے اولوالعزم لوگوں کی زندگیاں بھی ہمارے سامنے ہیں جو آج ہمارے لیے دلیل راہ ہیں۔ معین الدین چشتی' خواجہ بختیار کاکی' خواجہ نظام الدین اولیا' ان سب کے طرز عمل سے نہ صرف مسلمان بلکہ ہندو بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

کراچی ہی میں ایک دن پروفیسر صاحب کے ہمراہ محترم افتخار عدنی سے ملا۔ عدنی صاحب ادب و تصوف سے گہرا شغف رکھتے ہیں۔ عدنی صاحب نے ایک بڑی سیاسی شخصیت کے روحانی کارناموں پر روشنی ڈالی اور فرمایا کہ لوگ ان کی قبر پر جا کر مرادیں پاتے ہیں۔ اور وہ بڑی شخصیت مانگنے والوں کے خواب میں آ کر ان کے مسائل حل کرتی ہے۔ کرار صاحب بڑے انہماک سے سب باتیں سنتے رہے۔ جب باہر نکلے تو مجھ سے کہا: میاں رشید! ہمارے دماغ میں فکر و نظر کا ایک دیا ٹمٹما رہا ہے۔ اندیشہ ہے کہ کہیں بجھ نہ جائے' ایک دفعہ کوئٹہ تشریف لائے تو دوستوں کو ملاقات سے سرفراز فرمایا۔ لیکن جاتے وقت خاکسار اچانک ان سے مل نہ سکا۔ تو انہوں نے کراچی سے یہ خط بھیجا:

عزیز محترم ڈاکٹر رشید احمد سلام مسنون!

Message of Islam and Kerbala کے چار نسخے اور مطالعہ قرآن کے

سلسلے کی چند کتابیں روانہ کر رہا ہوں۔

Message تو آپ (پروفیسر انور) کھیڑا کے علاوہ باقی دو نسخے جسے اہل سمجھیں دیجئے گا۔ مطالعہ قرآن آپ کے لیے ہے۔ یہ تفسیر نہیں ہے۔ اس منصب کے لیے نااہل ہوں۔ یہ قرآن حکیم کی چند سورتوں اور متعلقہ تراجم و تفاسیر کے مطالعہ اور اس پر غور و فکر کا حاصل ہیں۔ اور یہ ہر انسان کا حق بلکہ فرض ہے۔

میں نے (خاکسار کی) "دارالعلوم دیوبند" کو ابھی پہلے باب تک ہی دیکھا ہے۔ آپ نے شاندار تعلیمی روایت کا اندر سے بھی تجربہ کیا ہے اور باہر کی دوسری ہم عصر روایات کی دید گاہ سے بھی دیکھا ہے۔ اس لیے نقد و نظر میں ایک سنجیدگی ہے۔ کوئی شک نہیں کہ یہ دارالعلوم وقت کے بہت اہم تقاضا کے جواب میں ظہور میں آیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کو ایسے ناقدانہ جائزوں کی بڑی ضرورت ہے۔ تاکہ اس میں جمود کے آثار نہ پیدا ہوں۔ تقویٰ اور توکل کو بھی زندگی اور روشنی کے لیے عصری شعور کی ضرورت ہے۔

اس روز ہم مہاتما گاندھی کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔ ان کی موت پر بہت نظمیں لکھی گئی تھیں۔ اختر حمید خان نے کسی شاعر کے دو شعر سنائے تھے۔ جو مجھے بہت پسند آئے، میں انہیں پیش کرتا ہوں:

مسافران ابد کی نہیں کوئی منزل
یہاں قیام کیا یا وہاں قیام کیا

صلہ تھا تیری ریاضت کا "صبح آزادی"
وہ صبح جس کو غلاموں نے ننگ شام کیا[1]

---

(1) گاندھی جی کی وفات پر خاکسار نے شاید مجاز کے دو شعر سنائے تھے:

ہندو چلا گیا، نہ مسلماں چلا گیا — انسان کی جستجو میں اک انساں چلا گیا
باچشم نم ہے آج زلیخائے کائنات — زنداں شکن وہ یوسف زنداں چلا گیا (بقیہ اگلے صفحے پر)

دوسرا پرچہ انور کھیڑاں کے نام خط ہے۔ وہ ان کو دے دیجئے گا۔ سب کو میری دعا کہیے گا۔ خاص طور پر ڈاکٹر انور خلیل کو جن کے ساتھ آپ "چائے پیائی" فرماتے ہیں۔ غالب کا وہ شعر یاد ہے:

چوں بارقیب نشینی و "چائے پیائی"
بیاد آر حریفاں بادہ پیارا

یہ حسب موقع حافظؒ کے اس شعر کی ترمیم تھی:

چوں بارقیب نشینی و بادہ پیائی
بیاد آرحریفاں باد پیارا

دعاگو کرار حسین

پروفیسر موصوف نے کراچی میں آکر قرآن کی آخری سورتوں پر لیکچر دیئے تھے۔ جنہیں سردار نقوی نے کراچی سے شائع کیا تھا۔ قرآن مجید کی تشریح و تعبیر پر یہ لیکچر پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

پروفیسر موصوف پر بہت کچھ لکھنا چاہتا تھا' خاص طور پر عنایت اللہ مشرقی سے ان کی ملاقاتوں کا حال۔ اس موضوع پر پھر کبھی لکھوں گا۔ پروفیسر موصوف اکثر یاد آتے ہیں' تو بے اختیار دل کی گہرائیوں میں یہ آواز گونجتی ہے:

اے ہم نفسان محفل من
رفتید ولے نہ از دل من

رشید احمد (جالندھری)

☆☆☆

(بقیہ) شمیم کرہانی نے یہ کہا تھا:

دکھی آتما شانتی پا گئی ہے جگاؤ نہ باپو کو' نیند آ گئی ہے